آوازیں آرہی ہیں اور وہ ہمہ تن کام میں مصروف ہیں۔ بادشاہ کو دیکھ کر وہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور خود ہی ملاحظہ فرمالیں کہ ہم کتنا عمدہ کپڑا بُن رہے ہیں"۔ بادشاہ اور درباریوں کو اگرچہ کپڑا نظر تو نہ آتا تھا لیکن محض اس خوف سے کہ اگر اس کے وجود کا انکار کیا گیا تو اُن پر حماقت اور بیوقوفی کا الزام لگ جائے گا، اُن میں سے ہر ایک نے اس "عجیب و غریب کپڑے" کی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تعریف و توصیف کرنی شروع کی۔

کپڑے بُننے والوں کے اس عیار گروہ کی جگہ مغربی اقوام رکھ لیں، بادشاہ کی جگہ امتِ مسلمہ سمجھ لیں اور "حماقت" کے الزام کو رجعت پسندی کے الزام پر قیاس کر لیں تو آپ کو ملّتِ بیضا کی اصل بیماری فوراً معلوم ہو جائے گی۔ ہم محض اس خوف سے کہیں مغربی دنیا ہمیں قدامت پسند نہ کہہ بیٹھے اُس احمق بادشاہ کی طرح مغرب کی ہر بات کی بے جانے بوجھے تصدیق کرتے چلے جاتے ہیں۔ مغربی تمدّن اپنے ساتھ جس قسم کی برائیاں اور جس قسم کے مصائب لایا ہے انہوں نے پوری دنیا کو جہنّم بنا رکھا ہے۔ مادیت پرستی نے انسانیت کی ساری ارفع و اعلیٰ اقدار کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اُس کے علم نے ایک نئے انداز کی جہالت اور اُس کی شائستگی نے بنی نوعِ انسان میں ایک نئی قسم کی وحشت پھیلائی ہے، اُس کی ترقی کی روشنی میں جہنم کی آنچوں کا اثر ہے اور اُن کی جلن کو یورپ کا ہر صاحبِ احساس اب بڑی شدت سے محسوس بھی کر رہا ہے لیکن اُس کے عیار علمبرداروں نے ہماری دولت و ثروت، ہماری آزادی اور ہماری متاعِ ایمان کو لوٹنے کے لیے ہمارے ذہنوں میں اسی طور پر یہ باطل خیال بٹھا دیا ہے کہ ہم میں سے جو لوگ یورپ کی ترقی کے ثنا خواں نہیں وہ لازمی طور پر دقیانوس، رجعت پسند اور ماضی پرست ہیں۔ ہم یورپین تہذیب و تمدّن کے بُرے اثرات اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہے ہیں

ہم پر اس کے علمبرداروں کے باطل دعووں کی حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے، اور ان کے ہاتھوں سے جس طرح ہم برباد ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، اُس کو بھی ہم نے پوری طرح جان لیا ہے پھر اس تہذیب نے جان و مال کے بے پناہ زیاں کے بعد انسانی اقدار کی صورت میں نوعِ بشری کو جو کچھ دیا ہے اُس کی قدر و قیمت کا بھی ہمیں پورا پورا اندازہ ہو گیا ہے، ان میں سے کوئی پہلو بھی اب ایسا نہیں جس کے بارے میں ہمیں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ لاحق ہو لیکن ہماری اخلاقی پستی اور بزدلی ملاحظہ ہو کہ ان سب حقائق کے سامنے آجانے کے بعد بھی مغربی تمدن کی تعریف میں محض اس لیے رطب اللسان ہیں کہ کہیں مغربی دنیا ہم پر "رجعت پسند" ہونے کا الزام نہ رکھ دے۔

چشمِ فلک نے اِس دھرتی پر اُس قوم سے زیادہ بدنصیب قوم کون سی دیکھی ہو گی جسے اللہ تعالیٰ نے پوری نوعِ بشری کی ہدایت و رہنمائی کا مقدس فرض سونپا ہو اور وہ خود گمراہ کن قوموں کی تقلید کے تحت باطل نظریات کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ وہ کسوٹی جس کی مدد سے لوگ کھرے اور کھوٹے کے درمیان تمیز کرتے ہیں وہ اگر خود ہی مسِ خام سے متاثر ہو کر اپنی یہ صلاحیت کھو بیٹھے تو پھر دنیا میں اس سے زیادہ بے وقعت اور بے وزن چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ غیروں کی اندھا دھند پیروی نے آج بدقسمتی سے دنیا کی اِس محتشم باشان قوم کو ذلت کی ایک ایسی پست سطح تک پہنچا دیا ہے جس کے بعد پستی کا اور کوئی تصوّر ممکن نہیں ہے۔ آج دنیا میں جانوروں کے گلوں کی بھی قدر و قیمت ہے، بے جان سکّے بھی اپنا ایک وزن رکھتے ہیں، مٹی پانی اور ہوا میں بھی اتنی کشش موجود ہے کہ وہ انسانی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکیں۔ آج اگر کوئی شئے سب سے زیادہ بے وزن اور ناقابلِ التفات ہے تو وہ انسانوں کی یہی بھیڑ ہے جسے لوگ "امتِ مسلمہ" کے نام سے یاد کرتے کے عادی ہیں، انسانیت کی تعمیرِ نو کے نئے جو نئے نئے

نقشے ترتیب دیئے جا رہے ہیں اُن میں قوموں کا تو ذکر ہی کیا درندوں اور پرندوں تک کے لئے جگہ موجود ہے لیکن اگر کسی کے لئے جگہ نہیں تو وہ یہی بدنصیب ملّت ہے جس کے افراد کی تعداد لاکھوں، نہیں کروڑوں تک پہنچی ہے۔

اس کی یہ حالت زادِ شروع سے ایسی نہ تھی، پورے ایک ہزار سال تک دنیا کی قیادت و رہنمائی کا منصب اسی قوم کو حاصل رہا، اس نے تہذیب کے گیسو سنوارے، عقل کو چار چاند لگائے، انسانیت کو زندگی بخش اقدار عطا کیں اور اسے حیوانیت کی سطح سے بلند ہو کر انسان کی حیثیت سے جینے کے آداب سکھائے۔ زمانہ پوری دس صدیوں تک اپنی رفتار کے لئے اس کے اشارۂ ابرو کا مرہونِ منت رہا۔ دنیا کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی میدانوں میں اس کی ایک ساکھ تھی اور اس کے فیصلے بہت بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے بلکہ اگر یہی کہا جائے کہ دنیا میں صرف اسی کے افکار و نظریات کا سکہ چلتا تھا، تو اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہ ہوگا لیکن آج اس کے لئے عزت کا کوئی منصب اور مقام باقی نہیں رہا۔

جب ایک انسان گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اس ملّت کی تباہی و بربادی پہ غور کرتا ہے تو وہ حیران ہوتا ہے کہ وہ قوم آج مغرب کی مادی تہذیب پر فریفتہ ہو کر اُس کے افکار و نظریات کی بھیک مانگنے میں مصروف ہے جس کا ماضی غزالی، رومی، ابن حنبل، ابن قیمؒ اور اسی قسم کے ہزاروں لاکھوں آفتابوں، مہتابوں سے درخشاں رہا ہے، جس کے پاس عطار، اجمیری اور جنید جیسے اہلِ دل، ابن خلدون، البیرونی جیسے مورّخ، حافظ و کندی جیسے علمائے طبیعی، ابن رشد جیسے فلسفی، بخاری و مسلم جیسے محدث، ابنِ تیمیہ اور ولی اللہ جیسے محقق، خالد، طارق اور محمدؒ بن قاسم جیسے جرنیل، حضرت علی اور عمر بن عبدالعزیز جیسے اہلِ بصیرت، حضرت عثمان اور عبداللہ بن عمر جیسے پاکباز، حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر فاروق

جیسے حکمران اور سب سے بڑھ کر سلسلۂ نبوت کے آخری اور سب سے زیادہ الوالعزم تاجدار کی حیات طیبہ کا ایک ایک حرف محفوظ ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری اور لافانی کتاب بھی موجود ہو۔جس قوم کے پاس فکر و عمل کے یہ بیش بہا خزانے موجود ہوں وہ اگر دوسروں کی کاسہ لیسی کرنے لگے تو اس سے زیادہ افسوس اور عبرت کا مقام کیا ہو سکتا ہے۔ دنیا میں پستی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ لیکن اس قوم کی پستی کی کوئی حد نہیں اور الفاظ کا کوئی ڈھانچہ اس کے بیان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے!

آخر سوچیے کہ دنیا نے ہمیں کیوں اُن رفعتوں اور بلندیوں سے دھکیل کر ان پستیوں تک پہنچا دیا ہے جن پر دنیا کی کوئی باوقار قوم ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ رہنا گوارا نہیں کر سکتی۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جن افکار و نظریات کے علمبردار تھے وہ زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے اور اس لئے ابلق ایام نے ہمیں مجبوراً گرد کی طرح پیچھے پھینک دیا یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم پر اُس احمق بادشاہ کی طرح "جدت" کا بھوت سوار ہوا اور دنیائے مغرب ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہمیں الّو بناتی رہی۔ اُس نے ہمارے دل و دماغ میں یہ باطل خیال راسخ کر دیا کہ مغرب کے سارے اوہام الہامات ہیں اور جو قوم ان سے والہانہ عقیدت مندی کا تعلق نہیں رکھتی وہ کم عقل، جاہل اور رجعت پسند ہے اور ہم نے محض ان الزامات سے بچنے کے لئے مغربی تصورات کی تعریف و توصیف شروع کر دی۔ شکاری اگر "سادہ لوح" شکار کو پھانسنے کے لیے جال کے ایک ایک حلقے کی تعریف کرے تو اس کی وجہ ذہن میں آ سکتی ہے لیکن حیرت اُس شکار پر ہوتی ہے جو اپنی آنکھوں کے سامنے آزادی جیسی قیمتی متاع کو لٹتا ہوا دیکھے لیکن محض اس خوف سے کہ کہیں چالاک شکاری اس کے دامن پر "قدامت پسندی" کا الزام نہ چپکا دے وہ خود

ہی زنجیر کے اِن حلقوں کی مدّاح سرائی میں مصروف ہو جائے۔

مغربی تہذیب کا کونسا ایسا نظریہ ہے جس کے بُرے نتائج تلخ حقائق کی صورت میں پوری دُنیا کے سامنے نہیں آ چکے۔ خود دنیائے مغرب کے اصحابِ بصیرت بھی ان کی تلخیوں سے کسی حد تک آشنا ہیں۔ لیکن اُن کے دماغ کا مغرورانہ احساس اعترافِ حقیقت میں ہمیشہ مانع رہتا ہے اور وہ اپنے اندر اُن حقائق کو کھل کر تسلیم کرنے کی جرأت نہیں پاتے۔ وہ اس معاملے میں ہمیشہ غیر معمولی رازداری سے کام لیتے ہیں لیکن اس ساری احتیاط کے باوجود حق بات کبھی نہ کبھی اُن کی زبانوں سے نکل ہی جاتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کیونکہ اہلِ مغرب کی قیادت و سیادت کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ دنیائے مشرق خصوصاً دنیائے اسلام میں اُن کے افکار و نظریات کی ہی برتری قائم رہے اور لوگ انہیں پر جانیں نثار کرتے رہیں اس لئے وہ اگر حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کریں تو اس کی بہر حال ایک وجہ ہے لیکن ہمیں تعجب اپنے بزرگوں کی اس طرزِ عمل پر ہوتا ہے جو مغربی اقدار کی بربادیوں کا نقشہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ابھی تک انہیں سینے سے لگانے پر مصر ہیں اور جن جن ممالک سے وہ ان کے بُرے اثرات کو زائل کرنے کی قدرت و طاقت رکھتے ہیں وہاں بھی وہ انہیں عوام کی مرضی کے علی الرغم ان پر مسلط کرنے کے درپے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ یہ نہیں کہ انہوں نے تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر ان اقدار کو ملک و ملت کے حق میں مفید اور نافع پایا ہے اس لئے وہ دیانتداری سے ملتِ مسلمہ کی خیر خواہی اسی میں دیکھتے ہیں کہ اسے ان اقدار کا پرستار بنایا جائے۔ ان جذبات میں سے کوئی جذبہ بھی ان کے اندر کام نہیں کر رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ملتِ بیضا پر ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں لیکن ہماری عقل یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ اس گئی گزری حالت میں بھی ہماری سربراہی کا منصب ایسے عقل کے اندھوں کو حاصل ہے جو مغربی تہذیب کی ناکامی اور بربادی کے سامنے آجانے کے

بعدبھی اُسے ابھی پوری طرح سمجھ نہیں پائے۔ ہمارے نزدیک اُن کی مغربی تہذیب و تمدن سے وابستگی کا اصل سبب، فہم کی کمی نہیں بلکہ جرأت کی کمی ہے۔ یہ حضرات اُس بے عقل بادشاہ کی طرح اصل صورت حال سے تو پوری طرح واقف ہیں اور دل کی گہرائیوں میں یہ بات جانتے ہیں کہ اُن کی ملت کو ترقی اور روشن خیالی کے نام پر لوٹا جا رہا ہے۔ لیکن وہ اس سے غیر معمولی شیفتگی کا اظہار صرف اس لئے فرما رہے ہیں کہ عیّار لوگوں نے اُن کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ جو شخص اس تہذیب کا مداح نہیں وہ رجعت پسند ہے۔ اس لئے یہ سادہ لوح محض اس الزام سے بچنے کے لئے اس پر جان چھڑک رہے ہیں۔

آپ ہماری ان معروضات پر صرف ایک مثال یعنی اتحادِ قومی کے لئے صحیح اساس کی روشنی میں غور فرمائیں۔ جو حضرات تاریخ سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسیحیت جب یورپ میں پہنچی تو اگرچہ وہ اپنی اصلی شکل میں نہ تھی اور اُس میں مختلف قسم کی خامیاں پیدا ہو چکی تھیں لیکن اس حالت میں بھی اُس میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے اثرات اور آسمانی تعلیمات کی چند خصوصیات بہر حال موجود تھیں۔ مذہب خواہ کتنا بگڑ جائے لیکن وہ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل اور وطن کی تفریق کا قائل نہیں ہوتا۔ اس بنا پر مسیحیت نے یورپ کی مختلف اقوام کے درمیان دینی تعلق قائم کر کے انہیں ایک دین کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ اور اس طرح پورا یورپ ایک خاندان بن گیا۔ فکر و نظر کی اس دور رس تبدیلی کا اندازہ مسیحی علما کے اقوال سے ہوتا ہے مثلاً ٹرٹولین کہتا ہے کہ ہم ایک جمہوریت کو جانتے ہیں اور وہ پوری نوعِ بشری ہے اور یحییٰ کہتا ہے کہ ہمارا ایک وطن ہے جس کی بنا بالفعل خدا نے ڈالی ہے۔

جب لوتھر نے اپنی مشہور دینی اصلاحی تحریک شروع کی اور رومی کلیسا کی مخالفت میں جرمن قوم کو صف آرا کر کے اُسے شکست فاش دی تو یورپ میں مذہب کی جس سلک میں

مسلک یقیناً وہ منتشر و متفرق ہو گئیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد مختلف اقوام کے اندر مسابقت اور رقابت کا جو جذبہ پیدا ہوا تو اُس سے یہ انتشار اور بھی افسوسناک صورت اختیار کر گیا اور دنیا کی ہر قوم نے خاکِ وطن سے قومی وحدت کا کام لینے کی کوشش کی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ اساس وسیع ہوتی چلی گئی اور معاملہ خاکِ وطن سے گزر کر رنگ و نسل تک جا پہنچا۔ سیاسیات کا ہر طالبِ علم اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ قومیت کی تشکیل میں مثبت اور منفی دونوں قسم کے جذبات کام کرتے ہیں۔ مثبت جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کے مختلف افراد کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا ہو اور منفی جذبات اس قوم کو دوسری اقوام سے ممیز کرتے ہیں۔ مدد دیتے ہیں۔ اہلِ مغرب نے مثبت جذبات کے لئے تو خاکِ وطن، رنگ اور نسل سے کام لیا۔ لیکن چونکہ اُن کے پاس کوئی روحانی اور اخلاقی قدر ایسی نہ تھی جس کی بنا پر وہ دوسری اقوام سے اپنے آپ کو ممیز اور ممتاز کرتیں اس لئے انہوں نے دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر کے اپنے گرد قومی دیواریں چنیں۔ چنانچہ نفرت اور خوف آج قومی زندگی کے ایسے ضروری عناصر قرار پائے ہیں جن کے بغیر اس میں جان نہیں آتی۔ قوم پرستی کا جوش اُس وقت تک پوری طرح کام نہیں کرتا جب تک کہ قوم کے سامنے کوئی چیز نفرت کرنے کے لئے نہ ہو۔ اس بنا پر قومی رہنما اس بات کا پورا پورا التزام کرتے ہیں کہ قوم کے یہ منفی جذبات کسی طرح سرد نہ پڑنے پائیں اور وہ جس لمحہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے اندر کمی واقع ہو رہی ہے تو وہ فوراً اس دکھتی رگ کو دبا کر اس میں ہیجان اور اشتعال اور جوش و خروش پیدا کر دیتے ہیں)۔

خاکِ وطن، رنگ اور نسل نے آج سے نصف صدی پیشتر تو قومی وحدت کے لئے ایک بری بھلی بنیاد فراہم کر دی تھی لیکن ہمارے اس دور میں زمان و مکان کی تسخیر کی وجہ سے زمین کے مختلف گوشے جس حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ ایک دُوسرے کے

قریب سمٹ کر آ رہے ہیں اُس نے اس بنیاد کو بالکل ناکارہ بنا کر رکھ دیا ہے اور اب دنیا اس بات کے لئے مجبور ہو گئی ہے کہ قومیت کی تشکیل کے لئے ان سے وسیع تر بنیادیں تلاش کرے۔ چنانچہ آج انسان معاشی اور سیاسی مفادات پر مجتمع ہو رہے ہیں لیکن پچھلے چند سال کے واقعات نے اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے کہ یہ نئی اساس پہلی بنیادوں سے بھی زیادہ کھوکھلی اور بیکار ہے۔ انسانوں کو دُوسرے سے منسلک کرنے اور انہیں ایک قوم بنانے کے لئے ایک ایسا رشتہ درکار ہے جو اُن کے مابین ایک قلبی تعلق اور لگاؤ پیدا کر کے اُن کے اندر فکری اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ وطن، رنگ اور نسل میں یہ صلاحیت کسی قدر موجود ہے لیکن معاشی اور سیاسی مفادات میں ایسی کوئی کشش نہیں جو لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر انہیں ایک وحدت بنا دے۔ معاشی مفادات انسانوں کے اندر ہمیشہ رقابت اور منافرت کے جذبات ابھار کر انہیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ آج دنیا میں جو فتنہ و فساد، کشت و خون اور قتل و غارت ہو رہا ہے وہ سب اسی معاشی رقابت کا نتیجہ ہے۔

اب دنیا حالات کے ہاتھوں اس بات پر مجبور ہو گئی ہے کہ وحدت قومی کے لئے کوئی ایسی بنیاد مہیا کرے جو روحانی اور اخلاقی ہو اور یہ ایک ایسی ضرورت ہے جسے دنیا کا ہر صاحبِ عقل اور صاحب احساس آج بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے۔ چنانچہ عہدِ حاضر کا سب سے زیادہ مشہور مورخ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی اسی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

> اس دنیا میں جب کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے دُنیا کی طنابیں کھینچ کر اُسے ایک گھر بنا دیا ہے۔

جبکہ پوری نوع بشری کو ایک سلک میں منسلک کرنے کے لئے مغربی طرز زندگی کے درمیان زبردست مسابقت جاری ہے' ____ ان حالات میں اخوت انسانی کی اسلامی روایات، مغرب کی منتفرق اور آزاد ریاستوں کے طور طریقوں کی بہ نسبت ہمارے عہد کی معاشرتی ضرورت کو احسن طریق سے پورا کر سکتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد دنیائے مغرب جن حالات سے گزر رہی ہے اُس میں اس چیز کا ہر وقت خطرہ لاحق ہے کہ یہ جالیس آزاد ریاستیں اُس خاندان کی طرح برباد نہ ہو جائیں جس کے افراد کے درمیان سر پھٹول جاری ہو۔ بدقسمتی سے ابھی تک مغرب کا رعب داب لوگوں کے دلوں پر قائم ہے اور اس وجہ سے وہ قومیت کے زہر کو دوسری اقوام کے اندر منتقل کر رہا ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ دنیائے اسلام میں بہر حال مغرب کے اس سیاسی جنوں کے راستے میں اتحاد و اخوت کی اسلامی روایات فراہم ہونگی۔ آج نوع بشری کو ایک عالمگیر سیاسی اور معاشرتی وحدت کی ضرورت درپیش ہے اور انسانیت کے حفظ و بقا کے لئے یہ ضرورت ماضی میں کبھی اتنی شدید نہ تھی جتنا کہ ہم اسے اس ایٹمی دور میں محسوس کر رہے ہیں

(دنیا اور مغرب ص ۳۰-۳۱)

اخوت انسانی، یا انسانیت کے لیے ایک اخلاقی اور روحانی وحدت ایک ایسا تقاضا ہے جس سے دنیا کا کوئی صاحب بصیرت صرف نظر نہیں کر سکتا۔ وقت آپ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وطن، رنگ اور نسل کی جنگ حدود سے نکل کر نوع بشری کی تنظیم کے لئے کوئی وسیع تر بنیاد تلاش کرو۔ ان حالات کے پیش نظر یہ تو ممکن ہے کہ امت مسلمہ کے سربراہ روشن خیالی اور ترقی پسندی کی بنا پر اسلام کے

تقاضوں سے غافل ہوں لیکن ہم اُن کے بارے میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوئے ظن نہیں رکھ سکتے کہ جو لوگ وقت کے تقاضوں کے تحت اسلام کی ازلی و ابدی تعلیمات تک کو بدل دینے کے درپے ہیں اور جنہیں ضبط تولید، آرٹ، کلچر، اختلاط مرد و زن زبان، رسم الخط، الغرض فکر و عمل کی معمولی سے معمولی جزئیات تک کے معاملے میں وقت کے تقاضوں کا شدید پاس ہے، وہ وقت کی اس سب سے بڑی اور اہم ضرورت سے ناواقف ہوں گے۔ وہ یقیناً حالات کے اشاروں کو پوری طرح جانتے ہیں، لیکن انہیں جاننے کے باوجود اُس احمق بادشاہ کی طرح محض اس لئے حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ مغرب کے روشن دماغوں نے ابھی اپنی حیات اجتماعی کی تشکیل اسلام کی روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر نہیں کی اور ابھی یہ کھٹکا موجود ہے کہ اگر ملّتِ بیضا نے کہیں یہ حرکت کردی تو اُس پر شاید مغرب کی بعض ترقی پسند اقوام کی طرف سے رجعت پسندی کا الزام لگایا جائے۔ ہم دراصل یورپین قوموں سے بھی زیادہ روشن خیال کہلانا چاہتے ہیں اس لئے کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں جس سے دوسروں کو ہماری قدامت پسندی کا شبہ بھی ہونے پائے۔

پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی، پروفیسر سارو کن، لارڈ لوتھین، جوڈ اور اسی قبیل کے دوسرے علما اگر انسانیت کی روحانی وحدت کا تذکرہ کریں تو یہ ان کی اپنی تحقیق ہے لیکن ہم اپنی ملت کے مائل بہ انتشار اجزا کو دینی رشتے سے جوڑنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ سارے روشن خیالوں نے ابھی اس رشتے کو تسلیم نہیں کیا اور اُن کے تسلیم کئے بغیر ہمارا اسے تسلیم کر لینا ہماری رجعت پسندی پر دلالت کرتا ہے اور یہ وہ الزام ہے جس سے بچنے کے لیے ہم نے اپنی انفرادیت تک کی قربانی دے دی ہے۔ مصر، ترکی، عراق، ایران میں ہم نے اسلام کا رشتہ اخوت توڑ کر، وطن، رنگ و نسل کی بنیاد پر

اپنی قومیت کی تشکیل کرتے ہیں جس قسم کی احمقانہ کوشش کی ہے وہ ایک بڑی ہی لفگار داستان ہے۔

امیر شکیب ارسلان جو ترکی کے حالات سے بہت باخبر اور ترکی جدید کے بانیوں سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف حاضر العالم الاسلامی میں اس کی کچھ تفصیل بیان کی ہے۔ ترکی کی وہ جماعت جو اسلامی قومیت کی حامی تھی اس کے مقابلے میں کوک الپ، احمد آغا ئف، یوسف آقشورا، جلال ساھر کی فکری رہنمائی میں ایک ایسی جماعت تیار کی گئی جس میں زیادہ تر طلبا اور نوجوان شامل تھے ان لوگوں نے دنیا کے سامنے برملا کہا کہ طورانی نسل نے انہیں ایک رشتہ میں منسلک کیا ہے وہ پہلے ترک ہیں، پھر مسلمان، اسلام کی ان کے نزدیک صرف اسی قدر اہمیت ہے کہ وہ طورانی قومیت کے لئے کچھ مفید ثابت ہوا ہے۔ طورانیت کے معاملے میں اُن کے غلو کا یہ عالم ہے کہ اُن میں سے بعض من چلے یہ کفر تک کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ ہمارا کعبہ صرف طوران ہے۔ وہ علانیہ اُس ظالم اور ستمگر فرمانروا کی تعریف کے گیت گاتے ہیں جسے دنیا چنگیز کے نام سے یاد کرتی ہے۔ بچوں کے لئے ایسی نظمیں تیار کی گئیں جن میں اس کے کارناموں کو اچھالا گیا اور پستی کی انتہا ہے کہ وہ قوم جس کی پیشانی خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکتی تھی وہ سفید بھیڑیے کی تقدیس بیان کرنے میں مصروف ہوئی کیونکہ انہیں تاریخ کی چھان بین سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ان کے طورانی آباو اجداد اسلام سے پہلے سفید بھیڑیے کے سامنے سر نیاز خم کیا کرتے تھے۔ اس سفید بھیڑیے کی بعض نئی کتابوں میں تصویریں بھی دی گئیں۔ علامہ شکیب ارسلان فرماتے ہیں کہ مجھ سے شیخ الاسلام موسیٰ کاظم مرحوم نے بیان کیا کہ میں نے ان نوجوانوں سے کہا عرب بھی بہت سی ایسی پست اور ادنیٰ چیزوں کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے توبہ کی اور اس بات پر فخر کیا کہ اللہ تعالےٰ نے ان پر بڑا احسان کیا ہے۔

کہ انہیں اس سے نجات دی اور کفر و شرک کی پستیوں اور ضلالتوں سے نکال کر انہیں توحید جیسی نعمت سے لذت آشنا کیا۔ حیف ہے تم پر کہ تم خدائے لم یزل کو چھوڑ کر سفید بھیڑیے جیسے ذلیل درندے کی عبادت کو زندہ کرنے کا عزم رکھتے ہو۔

بعینہٖ قومیت کا یہی جذبہ ایران، اور بہت سے دوسرے مسلم ممالک میں کارفرما ہے۔ ایرانی نوجوانوں کے دماغ میں قدیم ایرانی تہذیب کے احیاء کا سودا سمایا ہوا ہے اور اب وہ اسلام کے سرمدی پیغام سے منہ موڑ کر آتش پرست، کیومرث، اثنویت، زرتشت اور مانویت کو زندہ کرنے میں مصروفِ عمل ہیں، ایرانی ادب میں سے چن چن کر اُن شعراء اور ادباء کو نکالا جا رہا ہے جو اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے علمبردار تھے اور ان کی جگہ ان لوگوں کے افکار و نظریات کی ترویج و اشاعت کی کوشش ہو رہی ہیں۔ جنہوں نے آگ اور اسی طرح کے دوسرے مظاہرِ قدرت کے ساتھ رشتہ عبودیت استوار کر رکھا تھا۔

عرب ممالک بھی قومیت کی اسی لعنت میں بُری طرح گرفتار ہیں۔ وہاں کبھی وطن کی بنیاد پر عربوں کے اندر جذباتی ہم آہنگی پیدا کی جاتی ہے اور کبھی زبان کی اساس پر اُن کے درمیان رشتۂ اخوت قائم ہوتا ہے لیکن یہ ساری بنیادیں اتنی کمزور اور بودی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی مستقل اور پائیدار ثابت نہیں ہوتی اور ریت کے گھروندوں کی طرح منہدم ہو رہی ہیں۔

اس امت کی اس سے زیادہ سیاہ بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ امت جس نے آج سے چودہ سو برس پیشتر وطن، رنگ، نسل اور زبان کے مادی رشتوں کو توڑ کر دنیا پر یہ حقیقت ثابت کر دی تھی کہ انسان بنیادی طور پر اخلاقی اور روحانی احساسات کا حامل ہے۔ اس لئے ہر مادی اساس انسان کو دوسرے سے قریب کرنے اور اسے رشتۂ اخوت میں

منسلک کرنے میں ناکام ہو گی، وہ امت جس نے نوع بشری کو یہ سبق دیا تھا کہ اُس کے درمیان اگر تفریق ہو سکتی ہے تو وہ صرف حق پرستوں اور شیطان کے پجاریوں کے درمیان ہو سکتی ہیں، اور اس ایک تفریق کے علاوہ جو تفریق بھی ہو گی وہ سراسر باطل اور غلط ہو گی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات ۲)	اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

وہ امت جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بہترین امت بنا کر احقاق حق اور ابطال باطل عظیم الشان کام سپرد کیا تھا اُس کا آج یہ حال ہو گیا ہے کہ اُس کے نوجوان مصر کے اندر خدا و رسول کے نہایت ہی گھٹیا دشمن فرعون کے کارناموں کو اچھالنے میں مصروف ہیں اور اُسے اپنا ایک قابلِ فخر ہیرو سمجھنے لگے ہیں۔ آپ احادیث، و سیر کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیں، تو آپ کو معلوم ہو گا کہ حضور سرورِ کائنات نے کس طرح خون اور خاک، رنگ اور زبان اور اسی نوع کی دوسری قومی اور وطنی عصبیتوں کو مٹایا اور انسان اور انسان کے درمیان غیر فطری امتیازات کی تمام سنگین دیواریں مسمار کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے واشگاف الفاظ میں ارشاد فرمایا:۔

لَیسَ منا من مات علی العصبیۃ	جس نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں ہے
لیس منا من دعی علی العصبیۃ	جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں ہے
لیس منا من قاتل علی العصبیۃ	جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے

فتح مکہ کے بعد جب تلوار کے زور نے قریش کی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا دیا، تو حضور سرورِ دو عالم خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور اس میں پورے زور کے ساتھ یہ اعلان فرمایا:۔

خوب سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے ان قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہلِ قریش اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا ہے۔ اے لوگو! تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے تھے، نسب کے لئے کوئی فخر نہیں ہے، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں ہے، تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

آنکھیں خون کے آنسو رلاتی ہیں جب ایک انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ امّت جو دنیا سے رنگ و نسل کے امتیازات مٹانے کا عزم کر کے اٹھی تھی اور جس نے اس عالم میں انسان اور انسان کے درمیان سارے مصنوعی امتیازات ختم کر کے انسانوں کے مابین روحانی اور اخلاقی تعلق قائم کیا تھا وہ آج اِن غیر اسلامی امتیازات کو اُبھارنے میں مصروف کار ہے اور انہیں کے بل بوتے پر دنیا میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے خواب دیکھتی ہے۔ خدا اور رسول کے احکام سے تغافل تو تھا ہی لیکن کیا مغرب کی اندھی پیروی نے ہماری فکری صلاحیتوں کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے اور ہمیں اتنا بے حس اور بے بصیرت بنا دیا ہے کہ اب ہم میں وقت کے ان تقاضوں کو سمجھنے کی بھی قوت باقی نہیں رہی جن پر ہم اپنی قیمتی سے قیمتی متاع قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کیا اب ہمیں سوائے ناچ، گانے عیش و طرب، اور لہو و لعب کے وقت کا اور کوئی تقاضا نظر نہیں آتا۔

اس قوم کی مظلومیت اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ خود ان ظالموں کو، جن کے اندر احساس کی کوئی رمق باقی ہے، اس کی بے کسی اور بے بسی پر ترس آنے لگا ہے۔ اور عین نزع کے عالم میں جب کہ اس امّت کی روح کا رشتہ اس کے جسم سے منقطع ہوتے

والا ہے، خود دشمنوں میں سے صاحبِ احساس لوگ اس کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہہ رہے ہیں۔ اے بدنصیب لوگو! ذرا آنکھ کھول کر اُس امرت رس کو تو دیکھو جس کی تلاش میں آج پوری نوعِ بشری سرگرداں ہے۔ ہمیں تو اسے قبول کرنے میں بہرحال تردد اور تامل ہے۔ کیونکہ ہم اسے ابھی اپنے مزاج کے مطابق نہیں پاتے ابھی ہمارے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں اور ان میں سب سے بڑی رکاوٹ خود تمہاری یہ ناگفتہ بہ حالت ہے لیکن ہم جب تمہاری داستانِ حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس امرت رس سے لذت آشنا ہو کر تمہیں نہ صرف قوت و طاقت اور اقبال مندی کی دولت ہاتھ آئی تھی بلکہ نوعِ انسانی کی سچی، بے لوث خدمت کا شرف بھی حاصل ہوا تھا اسی سلسلہ میں آپ اسی مغربی مفکر کا دل سوز بیان ملاحظہ فرمائیں جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔

"بہت سے مغربی افکار و نظریات اور ادارے ایسے ہیں جن کا نوعِ انسانی کے حق میں خیر و برکت کا موجب ثابت ہونا محلِ نظر ہے اور ان نظریات میں ایک ہمارا قومیت کا مغربی تصوّر ہے۔ ترک اور بہت سی دوسری مسلمان قوموں میں مغرب کے دوسرے نظریات کی طرح اس نظریہ کا زہر بھی بڑی تیزی کے ساتھ سرایت کر رہا ہے ان حالات میں میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر یہ ملت جس کی درخشاں اور تابندہ روایات میں یہ چیز شامل ہے کہ مسلمان خواہ کسی نسل، رنگ یا خطہ ارضی سے تعلق رکھتا ہو، وہ دینی رشتہ کی بنا پر دوسرے کا بھائی ہے۔ اس کے بدن میں جب تنگ نظری اور تعصب کے اس نظریہ کا زہر پھیلے گا تو وہ بالآخر کس حسرتناک انجام سے دوچار ہو گی۔

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۶)

اے نبی[81]، ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر[82]، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر،[83]

---

[81] مسلمانوں کو نصیحت کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو خطاب کر کے چند کلماتِ تسکین ارشاد فرماتا ہے۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ آپ کو ہم نے یہ کچھ مراتبِ عالیہ بخشے ہیں، آپ کی شخصیت اس سے بہت بلند ہے کہ یہ مخالفین اپنے بہتان و افترا کے طوفان اٹھا کر آپ کا کچھ بگاڑ سکیں۔ لہٰذا آپ نہ ان کی شرارتوں سے رنجیدہ ہوں اور نہ ان کے پروپیگنڈے کو پرکاہ کے برابر بھی کوئی وقعت دیں۔ اپنے فرائضِ منصبی ادا کیے جائیے اور انہیں جو کچھ ان کا جی چاہے بکنے دیجیے۔ اس کے ساتھ ضمناً تمام خلق کو، جس میں مومن و کافر سب شامل ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا سابقہ کسی معمولی انسان سے نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑی شخصیت سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بلند ترین مقام پر سرفراز فرمایا ہے۔

[82] نبی کو "گواہ" بنانے کا مفہوم اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے جس میں تین قسم کی شہادتیں شامل ہیں:۔

ایک قولی شہادت، یعنی یہ کہ اللہ کا دین جن حقائق اور اصولوں پر مبنی ہے، نبی ان کی صداقت کا گواہ بن کر کھڑا ہو اور دنیا سے صاف صاف کہہ دے کہ وہی حق ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ ہے باطل ہے۔ خدا کی ہستی اور اس کی توحید، ملائکہ کا وجود، وحی کا نزول، حیات بعد الموت کا وقوع اور جنت و دوزخ کا ظہور، خواہ دنیا کو کیسا ہی عجیب معلوم ہو اور دنیا ان باتوں کے پیش کرنے والے کا مذاق اڑائے یا اسے